© rasailojaraid.com

''علامہ'' ذوالکفل بخاریؒ

ڈاکٹر محمد عمر فاروق

۱۹۸۳ء کی ایک دوپہر جامعہ خیرالمدارس ملتان کے مہمان خانہ میں احقر، مخدوم مکرم حضرت جانشین امیر شریعتؒ مولانا سیّد ابومعاویہ ابوذر بخاریؒ، اپنے ماموں جناب رفیق غلام ربانی مرحوم اور مولانا غلام یٰسین جہلمیؒ کے ہمراہ حفظِ قرآن مجید کی کلاس میں داخلہ کے لیے بیٹھا ہوا تھا کہ اِتنے میں دو لڑکے جن کی عمریں گیارہ، بارہ برس ہوں گی، کمرہ میں داخل ہوئے۔ اُن میں سے نسبتاً لمبے قد کے لڑکے سے حضرت شاہ صاحبؒ نے دریافت فرمایا کہ: ''تم نے گیلے کپڑے کیوں پہن رکھے ہیں۔'' تو اُس نے بے تکلفی سے پنجابی میں جواب دیا کہ: ''باہر مینہ ہورہیا سی، اِس لئی ساڈے کپڑے بھج گئے نیں۔'' [باہر بارش ہورہی تھی۔ اِس لیے ہمارے کپڑے گیلے ہوگئے ہیں۔] بعد میں تعارف ہوا تو پتا چلا کہ یہ نوعمر لڑکا شاہ صاحب کا بھانجا ذوالکفل بخاری ہے اور اُس کے ساتھی کا نام عبدالرؤف خبیب ہے جو بزرگ احرار رہنما ملک عبدالغفور انوری مرحوم کا نواسہ ہے۔ اگلے روز جب کلاس میں پہنچا تو خبیب سے معلوم ہوا کہ وہ اور ذوالکفل چھٹی جماعت میں ایک ہی سکول میں پڑھتے ہیں اور ذوالکفل خیرالمدارس میں ہمارے کمرہ نمبر ۳۰ کے قریب ہی رہتا ہے تو پھر ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ میں میٹرک کر چکنے کے بعد قرآن مجید کے حفظ کے لیے یہاں آیا تھا۔ عمروں کے تفاوت کے باوجود ہم تینوں میں دوستی کا اَٹوٹ رشتہ استوار ہوگیا۔

ذوالکفل اپنی معلومات کی فراوانی کی بناء پر ہم سے علم وذہانت میں کئی منزلیں آگے تھا۔ اِسی بناء پر میں نے اُس کا نام علامہ رکھ دیا جو ایک عرصہ تک اُس کے اصل نام کا حصہ بنا رہا۔ وہ گھر میں چھوٹا ہونے کی وجہ سے مُنّا اور ہمارے لیے علامہ تھا۔ ذکاوت وفطانت علامہ کی گھٹی میں پڑی تھی۔ جس کے آثار وقرائن اُس کے بچپن سے ہی ظاہر ہو رہے تھے۔ ذہین افراد ہی نت نئی شرارتوں کا دامن وسیع رکھتے ہیں۔ علامہ بھی ایسی ایسی شرارتوں کا موجد تھا کہ جب کبھی اُن کی یاد آتی ہے تو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ ایک دفعہ جب حضرت سیّد عطاء المحسن بخاریؒ نے تحریک طلباء اسلام کے زیراہتمام مختلف نعروں اور احادیث پر مشتمل سٹکر نما اشتہار چھپوائے تو علامہ اُن سے اشتہاروں کا ایک پلندہ لے آیا اور اُنھیں خیرالمدارس میں چسپاں کرنے کا پروگرام طے پایا۔ ہمارے اِس منصوبہ کا کسی تیسرے فرد کو علم نہیں تھا۔ اب خیال آتا ہے کہ اگر محترم کفیل شاہ صاحب اِس منصوبہ سے باخبر ہوجاتے تو ہمیں ضرور اِس اقدام سے منع کردیتے، کیونکہ خیرالمدارس میں تنظیم سازی کی بجائے تعلیم وتربیت کو مقدم سمجھا جاتا تھا جو ہر لحاظ سے قابلِ تحسین عمل تھا، مگر اُس جذباتی دور میں ہمیں تنظیم سازی کے مفہوم کا علم تھا اور نہ ہی اشتہارات لگانے کے بعد کے نتائج سے کوئی سروکار تھا۔ رات گئے علامہ ایک سٹول اور ایک مخصوص قسم کی بنی ہوئی گاڑھی گوند کا برتن لے آیا۔ مدرسہ کے کارپردازوں سے بچ بچا کر اِشتہارات لگادیے گئے۔ بہت سی گوند بچ گئی جو علامہ اپنے ساتھ واپس لے گیا۔ علی الصبح جب مدرسہ کے ذمہ داروں نے مدرسہ کے درودیوار کو رنگارنگ اشتہارات سے مزین دیکھا تو اُن کے کان کھڑے ہوئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور خاموشی کے ساتھ اُنھیں اتارنے کا عمل شروع کر دیا گیا۔ اُدھر علامہ جو ہماری طرح خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ اچانک اُس کی چھٹی حس بیدار ہوئی۔ وہ موقعِ واردات پر پہنچا اور خاموشی سے اپنی محنت کی بربادی کا منظر دیکھتا اور خون کے گھونٹ پیتا رہا۔ اِسی دوران اُس کے ذہن میں ایک انوکھے انتقام کا تانا بانا بُن گیا۔ وہ فوراً گھر پہنچا۔ بچی ہوئی گوند اُٹھائی اور مدرسہ کے بیت الخلاؤں میں داخل ہونے والی جگہ کے اوپر اَچھی طرح انڈیل دی۔ صبح جس نے بھی دعا **اَللّٰھم اِنی اعوذُ بک من الخبث و الخبائث** پڑھ کر بیت الخلاء میں قدم رکھا۔ وہ گوند سے پھسل کر علامہ کے منشاء کے عین مطابق ''خبث وخبائث'' سے لت پت ہوتا گیا۔ ہمارا علامہ دُور کھڑا اِن مناظر کو دیکھ کر جی ہی جی میں مسکراتا رہا اور صبح ''متاثرین'' کا شریکِ غم ہو کر بڑی بے دردی کے ساتھ ''مجرم'' پر فضیحتوں کے ٹوکرے برساتا رہا۔ آخر اُس سے بڑھ کر متاثرین کو دِلاسہ دیے بھی کون سکتا تھا!

میں ایک سال کے بعد چھٹیوں میں گھر واپس آ گیا اور علامہ سے رابطہ کرنے میں تاخیر ہوگئی تو علامہ کا غصہ سے بھرا رجسٹرڈ خط موصول ہوا۔ جس میں علامہ کی نثر نگاری کے بے نظیر جواہر ہویدا تھے۔ خط میں علامہ نے مدرسہ کے طلباء کو چھٹیاں ہونے پر مدرسہ کے سنسان ہو جانے کے بارے میں یہ شعر لکھا تھا:

یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں ''جانور''
اپنی اپنی بولیاں بول کر، اُڑ جائیں گے

میں نے ''جانور'' کو واوین میں لکھنے پر اِحتجاج کیا تو علامہ کے پاس جواز کے ڈھیروں دلائل موجود تھے۔ آخر علامہ سے جیت ہی کون سکتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح آخر وہی جیتا اور ہم ہی ہارے۔

میں چھٹیاں ختم ہونے کے بعد بوجوہ مدرسہ میں واپس نہ جاسکا اور گورنمنٹ کالج تلہ گنگ میں داخل ہوگیا۔ اِس دوران علامہ سے رابطہ کا ذریعہ فقط خط ہی تھا اور خطوط نگاری کا یہ سلسلہ کئی سال تک اتنے اہتمام کے ساتھ جاری رہا کہ ہر ہفتہ میں ایک دو خط ضرور لکھے اور وصول کیے جاتے رہے۔ علامہ کی پڑھائی کے مدارج اور امتیازی کامیابیوں کی خبروں، علامہ کے ادبی معرکوں کی روداد وں اور احرار رہنماؤں کی سرگرمیوں کے بارے میں اُس کے خطوط سے ہی آگاہی حاصل ہوتی رہی۔ اب اُس کے دوستوں کا دائرہ بھی وسیع ہو چکا تھا، لیکن ہماری دوستی میں سرِ مو فرق نہ آیا۔

علامہ سکول سے کالج پہنچنے تک اپنی علمی واَدبی صلاحیتوں کی دھاک بٹھا چکا تھا۔ نوائے وقت، مشرق، امروز، چٹان اور کالج میگزین میں اُس کی نگارشات شائع ہوتیں تو ایک عرصہ تک اُن کی گونج مختلف حلقوں میں سنائی دیتی رہتی۔ ایک نوعمر کے قلم سے سنجیدہ ہی نہیں، دقیق عبارات اور مشکل الفاظ سے مملو تحریریں کہنہ مشق ادیبوں کو بھی سر پکڑ کر سوچ میں غلطاں ہونے پر مجبور کر دیتیں۔ علامہ اپنی تخلیقات کے ایسے متاثرین کے احوال سے محظوظ ہوتا۔ جب اُس کی منظومات بعض ادبی پرچوں میں اشاعت پذیر ہوئیں تو اُن نظموں میں بھی فلسفہ کی گہرائی، ادق مضامین، مشکل الفاظ کا چناؤ اور خیالات کا عمق بدرجہ اتم موجود تھا۔ جس پر علامہ کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ بھائی تمھاری ادبی ''دہشت'' سب پر بیٹھ چکی ہے۔ اب خدارا سلیس نگاری پر ہاتھ رکھو اور ہم کم علموں کی دعائیں لو۔ جس پر اُس نے دل پر پتھر رکھ کر حتی المقدور عمل پیرا ہونے کی کوشش بھی کی۔ علامہ جس برق رفتاری سے کمال کی منزلوں کو طے کرتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے اُس کی اِس تیزی سے ڈر لگنے لگا اور اس بات کا شدت سے احساس ہونے لگا کہ شاید اُردو اور انگریزی زبان کے بعض نام ور جواں مرگ شعراء کی طرح اُس کے پاس بھی زندگی کی مہلت کم ہے۔ اِسی لیے وہ دھڑا دھڑ اپنے ادبی کاموں کی تکمیل کرتا جا رہا ہے۔ اللہ گواہ ہے کہ میں نے علامہ کو اَسّی کی دہائی میں ایک خط لکھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جس میں اُسے اپنے اندرونی خوف سے مطلع کرنے کی بجائے یہ لکھا کہ علامہ میرا دِل چاہتا ہے کہ اب تم اپنے رہوارِ قلم کو مت روکو۔ مہینوں کی بجائے اب ہر ہفتے تمھاری تحریر آنی چاہیے۔ زندگی، موت اللہ کے پاس ہے، مگر میں یہ چاہتا تھا کہ جتنی زندگی باقی ہے، علامہ زیادہ سے زیادہ ادبی ورثہ چھوڑ کر جائے، لیکن تقدیر سے کون لڑسکتا ہے۔ اب اُس کی جواں مرگی کا خیال آتا ہے تو دِل بیٹھنے لگتا ہے۔ علامہ نے اگرچہ کم کم لکھا ہے، لیکن جو کچھ اُس کے قلم سے نکلا۔ وہ اپنی جدت، تنوع، خیال آرائی اور معنی آفرینی کے اعتبار سے دسیوں ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات پر فوقیت رکھتا ہے۔

علامہ شاندار تخلیقی صلاحیتوں کی نعمت سے مالا مال ہونے کے علاوہ ایک شریف النفس اور پاکباز اِنسان بھی تھا۔ میں پورے ایقان کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کم از کم ہم چند بے تکلف دوستوں کے سامنے اُس سے کوئی گناہِ کبیرہ سرزد نہیں ہوا۔ وہ اپنے معمولاتِ دینیہ کا پابند تھا۔ صالحیت اُس کی فطرت میں تھی اور نجیب الطرفینی اُس کے خون میں آئی تھی۔ علامہ اپنی وراثتی روایات کا امین ہی نہیں، پاسدار بھی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کی ذات اُس کے خانوادے کی نیک نامی میں اضافہ کا سبب بنی۔ علامہ نے پدرم سلطان بود کا دعویٰ کبھی نہ کیا، حالانکہ اُس کے نانا جی کی شخصیت اپنے خداداد اِمتیازی اوصاف اور حلقۂ اثر کی بناء پر مقامی نہیں، بلکہ بین الاقوامی اثرات اور اہمیت رکھتی تھی، مگر علامہ نے اپنی ذاتی صلاحیتوں کو اِستعمال میں لا کر علم واَدب کے میدان میں اپنی شخصیت کا لوہا منوایا۔ حضرت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ سے نسبی تعلق اُس کی شہرت کا ثانوی باب تھا۔

ابھی گزشتہ سال دو جولائی کو علامہ، مکہ مکرمہ میں حرم شریف کے بابِ فہد میں ملنے کے لیے آیا تو اُسے جب پہلی مرتبہ عربی لباس پہنے ہوئے دیکھا تو محسوس ہوتا تھا کہ خانوادۂ بنی ہاشم کا کوئی بچھڑا ہوا شہزادہ پاکستان سے اپنی اصل یعنی ارضِ حجاز میں لوٹ آیا ہے۔ ڈھیروں باتیں ہوئیں۔ علامہ میرے والد گرامی (حکیم محمد ابراہیمؒ: جو ۱۳/ دسمبر ۲۰۰۹ء کو رحلت فرما گئے) سے مل بیٹھا اور اُن سے پُرخلوص دعاؤں کے خزانے سمیٹتا رہا۔ علامہ نے کھانے کی دعوت دی، لیکن اگلے دن ہماری مکہ مکرمہ سے واپسی تھی۔ اِس لیے اُس کی دعوت کو چند ماہ بعد حج بیت اللہ کے موقع پر قبول کرنے کا وعدہ کر کے معذرت کر لی، لیکن بلا کا جلد باز علامہ، میرے وہاں پہنچنے سے چند روز پہلے ہی ارضِ حرم کی مٹی اوڑھ کر اَمی خدیجۃ الکبریٰؓ کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا اور یوں وہ اپنی زندگی کا سفر تیزی سے مکمل کر کے اپنے اجداد کے قافلے سے جا ملا۔

مجھے یقین ہے کہ جب علامہ اپنے مقدس خون سے تر بتر کفن کے ساتھ امی جان حضرت خدیجہؓ کے حضور حاضر ہوا ہوگا تو مادرِ مہرباں نے اپنے اِس لاڈلے لختِ جگر سے امام سیّد ابوذر بخاریؒ کی طرح ضرور پوچھا ہوگا کہ ''بیٹا! تمھارے کپڑے کیوں گیلے ہیں؟'' تو علامہ نے کمال معصومیت سے عرض کیا ہوگا کہ: ''باہر مینہ ہورہیا سی، ایس لئی کپڑے بھج گئے نیں'' (باہر بارش ہو رہی تھی۔ اِس لیے کپڑے بھیگ گئے ہیں۔)

کیسا خوش نصیب تھا، علامہ! کہ دُنیا کی منہ زور آندھیوں اور اُمڈتے ہوئے طوفانوں سے بچ کر کونین کی مادرِ گرامی کے قدموں میں سکون وراحت اور طمانیت بھری نیند سو رہا ہے۔ علامہ! اللہ تمھاری مغفرت فرمائے۔ فردوسِ بریں میں اپنے اِس گناہ گار دوست کو کبھی مت بھولنا۔

© rasailojaraid.com